آرا و افکار

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی*

سید ابوالحسن علی ندویؒ: فکری امتیازات و خصائص

انیسویں صدی کے اواخر میں عالم اسلام سیاسی، عسکری اور علمی و فکری زوال کی انتہا کو پہنچ رہا تھا اور بیسویں صدی کے آغاز تک مغربی استعمار عالم اسلام کے حصے بخیے کرنے اور خلافت کے ادارہ کو توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال نے عالم اسلام میں بے چینی کی ایک لہر دوڑا دی اور ہر طرف علماے راسخین اور مجاہدین آزادی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف اسلامی تحریکات اور شخصیات دنیائے اسلام کے کونے کونے میں پان اسلام ازم اور احیائے اسلام کے مبارک ومقدس کاز کے لیے سرگرم عمل ہو گئیں۔

یہ زمانہ افکار و نظریات کی شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ مغرب کے صنعتی و سائنسی انقلاب نے وہاں کے حالات یکسر بدل دیے تھے۔ افکار و خیالات کی دنیا میں ایک نمایاں تغیر آ چکا تھا، اب جاگیرداری ختم ہو رہی تھی اور اس کی جگہ شراکت جمہور نے لے لی تھی۔ سرمایہ داری کی پرانی شکلیں تبدیل ہو کر اب بین الاقوامی تجارتی ادارے (M.N.C.S) قائم ہو رہے تھے۔ موروثی بادشاہت اور آمریت کی طنابیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے یکے بعد دیگرے ٹوٹ رہی تھیں۔ مزدوروں کے استحصال نے سرمایہ دارانہ نظام اور بورژ روا طبقہ کے خلاف سخت معاندانہ رجحانات پیدا کر دیے تھے۔ انفرادی ملکیت کی بجائے اب سیاست و معیشت کے اداروں میں پرولتاریہ خیالات کی گونج سنائی دے رہی تھی اور یہ فکر زندگی کے ہر شعبہ کو شدت سے متاثر کرنے لگا تھا۔

مغربی نشاۃ ثانیہ کی پرورش و پرداخت اصلاً یہودی دماغ نے کی تھی، چنانچہ الحاد، بے دینی اور اخلاق سے بیزاری اس نئی تہذیب اور نئی بیداری کی نمایاں علامتیں بن گئیں۔ اب عقل انسانی ہی ہر چیز کی میزان، اور افادیت و نفع بخش ہی تمام اعمال کے خیر و شر ہونے کا پیمانہ بن گئے۔ مذہبیات اور روحانیات پر الحاد و تشکیک کی ہوائیں چلنے لگیں اور نئی نسلوں کے اذہان وقلوب کو متاثر کرنے لگیں۔ قومیت اور نیشنل ازم کی آوازیں اس زور سے اٹھیں کہ وطن پرستی ہی ''روح عصر'' سمجھی جانے لگی۔ عالم اسلام خود مختلف عصبیتوں اور قومیتوں کا شکار ہو گیا۔ فکری زعامت اور علمی و تحقیقی امامت بھی مشرق سے چھن کر اب مغرب کو منتقل ہو چکی تھی۔ عالم اسلام پر اب عسکری و سیاسی حملوں کے بجائے علمی و فکری یلغاریں زیادہ ہو رہی تھیں اور حکومت و ریاست اور سیاست و معیشت کے مختلف اور متعدد نظریات سامنے آ رہے تھے۔

ایسی صورت حال میں عالم اسلام میں اٹھنے والی مختلف تحریکات اور ان کے فکری رہنماؤں کی تحریروں اور تعبیروں میں

---

*ڈائرکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز جامعہ نگر نئی دہلی۔ ghitreef1@yahoo.com

خارج کے دباؤ کے تحت کچھ افراط وتفریط کا آجانا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ انسان ہر حال میں اپنے ماحول اور اردگرد کی فضا سے اثر پزیر ہوتا ہے۔ چنانچہ برصغیر میں مدرسہ مودودیؒ کے پیدا کردہ لٹریچر اور اس کے بانی کی خاص مصطلحات میں اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔[1] اسی طرح عالم عرب میں عظیم اسلامی تحریک ''الاخوان المسلمون'' کے ایک بڑے فکری رہنما اور مجاہد سید قطب شہیدؒ کی بعض تحریروں میں بھی انہیں خیالات کی بازگشت ملتی ہے۔[2] برصغیر کی بعض دوسری اور تحریکوں میں بھی افراط وتفریط کی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ ان میں سے بعض مغربی انقلاب سے شدید طور پر متاثر تھیں اور بعض خالص صوفیانہ نقشہ کے ساتھ اصلاح کا کام کرنا چاہتی تھیں۔[3]

تحریکی و انقلابی تصور دین کی علمبردار جماعتوں اور تحریکوں نے بلاشبہ دین کی مدافعت ونصرت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کئی نسل کو الحاد وتشکیک کے حملوں سے بچایا، مستشرقین اور متجددین کے اعتراضات کے جواب دیے، اسلام سے متعلق مختلف پہلوؤں پر عصری اسلوب وآہنگ میں لٹریچر فراہم کیا۔ بایں ہمہ چونکہ ان میں سے بیشتر اسلامی تحریکات کا پہلا دور جوش وخروش اور انقلابی جزیات اور تبدیلی کے ایک عمومی نشانہ کو لے کر ہوا تھا، اس بڑھی ہوئی انقلابیت کی وجہ سے کہیں پر جابر ومستبد مسلمان حکمرانوں سے ٹکراؤ اور تصادم کی کیفیت پیدا ہوگئی اور کہیں پر بنیادی فکر اور لٹریچر میں دین کی تعبیر وتشریح کے سلسلہ میں افراط وتفریط نے راستہ پالیا، حتیٰ کہ جوشیلے نوجوان کارکن اور نسبتاً زیادہ انقلابی افرادان تحریکوں سے بھی مایوس ہوکر الگ الگ گروپ بنانے میں جٹ گئے اور نیا خون کم ملنے کی وجہ سے اب اکثر تحریکیں تعصب وتحزب اور جمود فکری کا شکار ہونے لگی ہیں۔

دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں بحکم ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی'' امت مسلمہ کی ۱۴سو سالہ تاریخ زوال و ادبار، انحطاط وتنزل کے ساتھ ہی اصلاح وتجدید سے بھی معمور رہی ہے۔ امت کی اس پوری تاریخ میں عام روایت یہ رہی ہے کہ مصلحین ومجددین بلا استثنا پوری قوم کو اپنا مخاطب بناتے تھے۔ انھوں نے کسی تحریک وتنظیم کے تصور کی اساس پر کام نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاح وتجدید کی تاریخ میں عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے لے کر حسن بصریؒ، عبدالقادر جیلانیؒ، غزالیؒ واشعریؒ تک اور ابن تیمیہؒ وابن خلدونؒ سے لے کر امام ربانی مجدد الف ثانی سرہندیؒ اور امام ولی اللہ محدث دہلویؒ تک سب کے سب امت کی مشترکہ میراث بن گئے اور آنے والی نسلوں نے ان سے بلا استثنا کسب فیض کیا۔ ان عبقری شخصیات نے فقہی جمود، مسلکی اور جماعتی تعصب کی تنگ نائیوں اور محدودیتوں سے نکل کر فکر اسلامی کے آفاقی اور وسیع تصور کو سامنے رکھا۔

بیسویں صدی میں اٹھنے والی انقلابی تحریکیں امت میں ایک نئی روایت کا آغاز تھیں۔ ان سے امت کی اصلاح وتجدید کا یہی نکتہ پوشیدہ رہ گیا۔ بطور خاص برصغیر میں دین کی تعبیر کے لیے جو اسلوب اختیار کیا گیا، جولب ولہجہ اپنایا گیا، وہ یہاں کے لیے ایک نئی اور نامانوس بات تھی۔ اس کے باعث، نیز یہاں کے مخصوص حالات کے پیش نظر علما کی بڑی تعداد اس تحریک سے دور ونفور ہی رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص فکری حلقہ پیدا کرنے کے علاوہ یہ تحریکیں کوئی ہمہ گیر شکل اختیار نہ کر سکیں۔ عوام قابل ذکر تعداد میں ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور ساری صلاحیتوں اور امکانات کے باوجود ان کے اثرات عام طور پر بہت محدود ہوکر رہ گئے۔

مذکورہ تحریکات کی نشو ونما اور ارتقا کا زمانہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے عنفوان شباب کا زمانہ ہے۔ مولانا نے ان میں سے بیشتر تحریکات اور ان کے بانیوں کو دیکھا، پرکھا اور برتا تھا۔ کئی ایک سے ان کی عملی وابستگی بھی رہی۔ اپنے فکری سفر کے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے بالآخر وہ خود ''ایک شخص ایک کاروان'' کی شکل اختیار کر گئے۔ گزشتہ نصف صدی کی عظیم

علمی وفکری شخصیات کے مابین مولانا تنہا ایک ایسے داعی ومفکر اور روحانی قائد اور مرشد امت ہیں جو ان ساری محدودیتوں سے نکل کر بذات خود ایک مدرسہ فکر کی حیثیت اختیار کر گئے۔ مولانا ندویؒ کی زندگی، ان کی عقلیت کے تکوینی عناصر، ان کا خاندانی پس منظر، ان کے اساتذہ گرامی قدر، ان کی تعلیم وتربیت اور فکری نشوونما، ان کی تصنیفات، ان کے عملی کارناموں اور ان کی اصلاحی ودعوتی جدوجہد کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور آئندہ بھی ان پہلووں پر بہت سا کام ہوگا۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا کا فکری خمیر تحریک شہیدین کی جامع روح پرور اور انقلابی وتجدیدی دعوت سے اٹھا تھا۔ یہی تحریک تھی جو ان کے دل میں جاگزیں ہوگئی تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد وہ اسی تحریک کو مثالی اور آئیڈیل نمونہ تصور کرتے تھے، اور اسی کے عملی مظاہر اور تقاضوں کی تلاش وجستجو میں انھوں نے مختلف شخصیات اور مختلف مراکز دعوت وفکر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ سید مودودیؒ سے ان کا فکری رشتہ اسی کی خاطر استوار ہوا تھا۔ بستی نظام الدین کے مرکز تبلیغ کی طرف ان کے قدم تبلیغی تحریک کے وسیع تناظر کو دیکھتے ہوئے ہی اٹھے تھے جو افسوس کہ بانی تبلیغ، مصلح امت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے ذہن ہی میں رہا اور ان کی وفات پر ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ عالم عربی کے مجدد امام حسن البناءؒ کی تحریک اور ان کا منہج عمل اپنے جلال وجمال میں اسی تحریک کا پرتو نظر آیا اور مولانا نے اس سے فیض اٹھانے میں کمی نہیں کی۔ غرض یہ کہ ان کا اصل مایہ خمیر تحریک شہیدین تھی، اسی مشن کو انھوں نے اپنا مشن بنایا اور تاحیات اس مشن کے وفادار رہے، اور خود ان کا وجود مسعود بھی اس تحریک کا معنوی وامتداد وتسلسل بن گیا۔

مولانا ندوی کا بنیادی وصف یہ تھا کہ وہ عالم اسلام میں منصب توجیہ وترشید پر فائز تھے۔ عصر حاضر میں دین کی نئی تعبیر وتشریح کا مسئلہ پیش آیا اور بعض مفکرین سے اس سلسلہ میں بعض تسامحات ہونے لگے تو مولانا نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اس ضمن میں اپنے بعض محبوب رفقا اور دوستوں پر بھی علمی تنقید ومحاسبہ کا فرض انجام دیا اور عصر حاضر میں دین کی تشریح وتوضیح کے سلسلہ میں مولانا مودودیؒ کی تعبیری فروگزاشتوں کا بھی مواخذہ کیا۔ اریـد ان اتـحـدث الـى الاخوان اور کتاب ''البـصـائر''، ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' اور ترشـيـد الـصـحـوة الاسلامية سب اسی ترشیدی وتوجیہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جب برصغیر کے ایک تحریکی حلقہ میں یہ مسئلہ بڑے شد ومد کے ساتھ اٹھایا گیا کہ قرآن کے مخصوص مصطلحات کے معنی ومفہوم پر صدیوں پردہ پڑا رہ گیا تھا تو مولانا نے اس بات کی شدت کے ساتھ تردید کی اور علمی اور مثبت انداز میں ''دعوت وعزیمت'' کا ایک تاریخی سلسلہ لکھا۔ یہ پورا سیٹ اصلاً ان کے اس دعوے کا علمی ثبوت تھا کہ امت میں اصلاح وتجدید کا ایک تاریخی تسلسل قائم رہا ہے اور کسی مرحلہ میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ دین کے مجموعی مفاہیم امت سے مستور ہو گئے ہوں۔ مـاذا خسـر الـعـالم بانحطاط المسلمين اور ''الـصـراع بين الفكرة الغربية والـفـكـرة الاسلامية'' میں انھوں نے مختلف اسلامی ممالک میں امت کے ماضی حال ومستقبل کا ایک بصیرت افروز اور مؤرخانہ وناقدانہ جائزہ لیا، زوال وادبار کے عوامل کی نشاندہی بھی کی اور موجودہ حالات میں عالم اسلام کس راستہ کو اختیار کرے، اس سوال کا جواب دیا اور واضح منہج عمل مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عالم اسلام نے مولانا کی اس توجیہ وترشید کو دل سے قبول کیا ہے، چنانچہ تحریکات اسلامیہ کے موجودہ منہاج عمل اور عملی طریقہ ہائے کار میں اس کے اثرات کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا اس صدی کے بہت بڑے فکری قائد اور روحانی مرشد ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا دوسرا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ فقہی توسع کے قائل اور اس کے علمبردار تھے۔ انھوں نے جمود وتقلید کے بجائے ہمیشہ اجتہاد کی دعوت دی۔ عشق رسول، اتباع سنت، اور احترام سلف کے ساتھ تربیت باطن اور تزکیہ واحسان کو

مطلوب شرعی قرار دیتے رہے۔ انھوں نے تصوف کو بدعات وخرافات اور عجمی اثرات سے پاک کرنے کی دعوت دی اور کتاب وسنت پر مبنی تصوف (احسان) کو روح دین سے کبھی متصادم نہیں سمجھا بلکہ اگر دیکھا جائے تو صحیح معنی میں انھوں نے ہی برصغیر میں پہلی بار علم تزکیہ (تصوف) کی تجدید کی اور اسے بدعات وشرکیہ اعمال سے اس کی تطہیر کی بنا رکھی۔ اسی سلسلہ میں ان کے گہر بار قلم سے ربانیة لا رهبانیة نکلی۔ انھوں نے پوری ملت کو اپنا مخاطب سمجھا اور بنایا۔ جماعت دیوبند سے بھی انھیں ویسی ہی محبت تھی جیسی تحریک ندوہ سے۔ محدثین کے مسلک سے بھی انھیں عقیدت تھی اور متبع سنت صوفیا اور سلاسل تصوف کے بھی وہ قدردان تھے۔ گویا ان کی ذات میں تحریک ندوہ کی بازیافت ہوئی تھی اور اس کی اصل روح عود کر آئی تھی۔ المیہ یہ ہے کہ مولانا کے اس فکری اور عملی توسع کو بعض خوردہ بیں اور کوتاہ چشم فکر وعمل کا تضاد سمجھتے ہیں۔

مولانا ندویؒ نے دین کی سیاسی تعبیر پر تنقید کی، تاہم وہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی دین وسیاست کی دوئی اور تفریق کے قائل نہیں رہے۔ انھوں نے اسلام کی شوکت، خلافت کے ادارہ کے احیا اور عالم اسلام کے اتحاد اور قوت کی آرزو کی، اس کے لیے کوششیں کیں اور عالم اسلام کے سربراہوں، امرا، مفکروں اور دانشوروں سے جماعتوں اور ان کے قائدین سے اس سلسلہ میں کھلی باتیں کیں۔ ان کا سلسلہ ''اسعمیات'' اس پر شاہد عدل ہے۔ انھوں نے عالم اسلام کے مسائل سے ہمیشہ تعلق رکھا، مسلمان امرا کو ان کے فرائض سے متعلق آگاہ کرتے رہے، انھوں نے مصر کی ناصریت، عربی قومیت اور ترکی کی کمالیت پر تنقید کی، مسجد اقصیٰ اور مقبوضہ فلسطین کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

امت کے ضیاع پر مولانا ابوالحسن علی ندوی (جو عرف عام میں علی میاں ندوی کے نام سے معروف ہیں) انگاروں پر لوٹتے تھے، لیکن ان کا یہ درد محض احساس وشعور اور قرطاس وقلم تک ہی محدود نہ تھا، انھوں نے امت کا مرثیہ پڑھنے اور آہ وبکا کرنے پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ وہ قنوطیت اور یاسیت کے بھی شکار نہ تھے نہ ہی خوش فہمیوں میں مبتلا رہے، بلکہ میدان عمل میں آ کر ایک دیدہ ور سپاہی کی طرح اور ایک باشعور اور بابصیرت قائد کی طرح ہر محاذ پر آگے نظر آئے۔ وہ ڈرائنگ روم مفکروں، گوشہ نشین علما و مدرسین اور زمانے کے اندھیروں اور اجالوں سے بے خبر ''ہو حق'' کی ضربیں لگانے والے عابدوں اور زاہدوں میں سے نہیں تھے بلکہ ان کی پوری زندگی تمام تر علمی و تحقیقی مشغولیتوں، عبادات کے ذوق وشوق اور روحانی ریاضتوں کے باوجود سرتاپا جہد وعمل سے عبارت تھی۔ وہ عالم اسلام میں ہونے والے ہر قسم کے تعلیمی وتربیتی، دعوتی اور اصلاحی کاموں میں تعاون کرتے اور اصلاحی تحریکات کے پشت پناہ اور مؤید اور ان کے لیے دعا گو بھی تھے۔

مولانا ندویؒ کو فکر ارجمند کے ساتھ دل دردمند بھی عطا ہوا تھا۔ دین ظلم سے، کفر اور شرک سے نفرت سکھاتا ہے، لیکن ایک انسان کے ساتھ (چاہے وہ کافر ومشرک ہی کیوں نہ ہو) وہ فرخ دلانہ، مصلحانہ اور ناصحانہ رویہ کا طالب ہے۔ ہر نبی کی دعوت میں یہ چیز نہایت ابھری ہوئی ہے کہ ہر نبی نے اس راہ کی تمام مشکلات کو خندہ جبینی سے برداشت کیا اور قوم کی طرف سے پیش آنے والی مصیبتوں اور اذیتوں کے باوجود انا لکم ناصح امین ہی کہا۔ علمائے حق اور مصلحین امت بھی انبیا کی نیابت کرتے ہیں۔ بنی آدم کے لیے ہمدردی وغم گساری، بلند انسانی قدروں کی حفاظت، حق کی طرف داری، مظلوموں کے حق میں آواز اٹھانا، اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنا وغیرہ جیسے عناصر کا پایا جانا دعوت واصلاح کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ مولانا کی ''پیام انسانیت'' کی تحریک دراصل ایسی جذبہ واحساس کی ایک تعبیر ہے۔

آج عقلیت کا دور دورہ ہے۔ سائنٹفک ریسرچ وتحقیق کے نام پر الحادی تہذیب اور تشکیک کی فضا پھیلائی جا رہی ہے۔ اس صورت حال میں دینی مفاہیم اور تعلیمات کی تشریح کے لیے عصری اسلوب کا استعمال وقت کا تقاضا اور ایک ناگزیر دعوتی

ضرورت ہے۔ اس صدی کے کئی بہترین دماغوں نے عقلی اور استدلالی اسلحوں سے لیس ہو کر اسلام کی نصرت واشاعت کا کام کیا ہے جس کی مثال میں مولانا وحید الدین خان کی شاہکار کتاب ''مذہب اور علم جدید کا چیلنج'' کو پیش کیا جا سکتا ہے اور ان کا یہ کام اپنی جگہ نہایت مہتم بالشان اور ضروری ہے اور مولانا ندویؒ عصری اسلوب میں کام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ تاہم یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان عقل و منطق کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔ عقل اور سائنس انسان کے دل میں شکوک و شبہات کے بیج بو سکتے ہیں، اسے ایمان و یقین کی حرارت اور طمانیت قلب کی دولت نہیں دے سکتے۔ یہ چیز تو اسے صرف قلب و روح کی تسکین اور جذبہ وضمیر کے اطمینان کے راستے سے مل سکتی ہے۔ مولانا کا یہ ایک بہت بڑا امتیاز ہے کہ وہ عقل سے زیادہ جذبہ کی تطہیر اور فکر سے زیادہ عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی انبیا و مصلحین کی دعوتوں کا مزاج بھی رہا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں اس حقیقت کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ "الا ان فی الجسد لمضغة اذا صلح صلح الجسد کله و اذا فسد فسد الجسد کله، الا و ھی القلب"۔

موجودہ زمانہ فن کا زمانہ ہے۔ آج فن سے کام لے کر لوگ اس فکر و خیال کی بھی جاندار و شاندار ترجمانی کر دیتے ہیں جن سے انہیں کوئی قلبی تعلق اور دلی وابستگی نہیں ہوتی۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہے کہ داعیوں کی کثرت اور مطبوعہ اور مسموعہ لٹریچر کی زیادتی کے باوجود متوقع اثرات ونتائج حاصل نہیں ہو رہے ہیں۔ آج کتنے ہی سحر انگیز خطیب، کتنے ہی وسیع المطالعہ دانشور اور بلیغ طرز ادا کے مالک مصنفین اور جادو نگار ادیب اور محقق مل جائیں گے جن کے فکر و عمل میں واضح تضاد ملتا ہے، جن کے بولنے اور لکھنے پر فدا ہونے والے اور سن کر مسحور ہو جانے والے ان کی سیرت و کردار کو دیکھیں تو یقیناً انہیں ان کی سطح سے بہت گرا خیال کریں اور ان پر نفرین بھیجنے لگیں۔ دانشوروں کی اس بھیڑ میں مولانا علی میاںؒ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ ان کے ہاں دانش و بینش بھی ہے اور ایمان ایقان کی سرور آگیں کیفیت بھی۔ ان کے حرف حرف سے اخلاص وللٰہیت ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کی پرشکوہ اور خطیبانہ طرز کی تحریروں وتقریروں میں فصاحت و بلاغت کی چاشنی بھی ہے، حرارت قلب اور جوش عشق کا سامان بھی۔ کثرت معلومات اور تحقیق کے اعلیٰ درجہ پر ہوتے ہوئے بھی ان کے بول بول میں ایک عجیب طرح کی روحانی کشش ولذت پائی جاتی ہے۔ ان کا قاری انہیں پڑھ کر جوش عمل سے سرشار ہو جاتا ہے اور اسے کہیں بھی قول و فعل میں تضاد یا دورنگی کا احساس نہیں ہوتا اور مصنوعیت اور لفاظی کا خیال نہیں ہوتا۔

مولانا علی میاںؒ کے ہاں فن بھی ہے اور فنی نزاکتوں کا بھرپور احساس بھی، تاہم فن سے زیادہ مقصدیت ان کے پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ ادب برائے ادب کی تخلیق نہیں کرتے بلکہ ادب کو ایک اعلیٰ اور بلند انسانی زندگی کی تعمیر کے لیے استعمال کرتے ہیں اور عالمی رابطہ ادب اسلامی ۵ دراصل ان کے اسی ادبی فکر کا عملی مظاہرہ ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ اردو و عربی دونوں کے ایک صاحب طرز انشا پرداز ادیب ہیں، اسی طرح وہ ایک کامیاب سوانح نگار، اور صاحب نظر ناقد و مؤرخ ہیں، لیکن اس سب سے زیادہ وہ ایک دل دردمند رکھنے والے داعی، دیدہ ور مصلح اور صاحب فراست مربی ہیں۔

حواشی

۱ مولانا مودودی اور سید قطب کی تحریروں میں دین کے سیاسی پہلو پر غیر ضروری زور دیا گیا اور ان کی تشریح کی رو سے دین کی سماجی واجتماعی نظام زندگی کی حیثیت زیادہ ابھر کر سامنے آئی اور اس کا تعبدی پہلو کمزور پڑ گیا جس کے اثرات ان کے پیدا کردہ لٹریچر میں بھی صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ فکر تفہیم القرآن، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر، اور 'خطبات' میں نظر

آتا ہے، تاہم اس کو خاص منضبط انداز میں انہوں نے 'قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں' میں پیش کیا ہے جس میں انہوں نے الٰہ، رب، عبادت اور دین کے معانی ومفاہیم لغت عرب کی بنیاد پر متعین کیے ہیں، ان کے مطابق صفات الٰہیہ میں حاکمیت الٰہ اور اقتدار اعلیٰ ہی اصل اور بنیادی صفت ہے۔ اس فکر پر مفصل نقد کے لیے ملاحظہ ہو "تعبیر کی غلطی" مؤلفہ مولانا وحیدالدین خان اور "عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح پر ایک نظر" از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

۲۔ سید قطب نے بھی معالم فی الطریق اور فی ظلال القرآن میں متعدد مقامات پر اس فکر کی ہم نوائی کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اخص خصائص الالوھیة الحاکمیة۔

۳۔ اصل میں دین کی عصری تعبیر ایک دودھاری تلوار کی طرح ہے جس میں اگر ذرا سا بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور حد سے تجاوز ہو جائے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ عنایت اللہ مشرقی جیسے عبقری اور ذہین انسان نے جب ٹھوکر کھائی تو خاکسار تحریک چلائی اور دین کی عصری تعبیر کے نام پر علما کی شدید و بے جا مخالفت شروع کر دی۔ عبادات کے نظام اور قرآن کی ترتیب اور نظم کی تفہیم میں من مانی تاویلات کیں، نماز کو فوجی پریڈ بنا دیا۔ علما سے سائنس داں مراد لیے۔ مشرقی صاحب کی یہ نئی تاویلات ان کی کتاب تذکرہ میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ اس کتاب اور اس کے تکملہ میں انہوں قرآن کی نزولی ترتیب وضع کی ہے، اور اسی کو اصل قرار دیا ہے، نیز علما کی مخالفت میں "ملا کا نیا دین" ۱۔۲۔۳ نہایت استہزائیہ انداز میں لکھی۔ اسی طرح غلام احمد پرویز نے دین کی معاشی اور سوشلسٹ تعبیر کی اور زکوٰۃ کا پورا سسٹم انہیں ذاتی ملکیت کے خلاف نظر آیا جیسا کہ ان کی کتاب "لغات القرآن" اور "نظام ربوبیت" سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ہاں انکار حدیث کا رجحان اس پر مستزاد ہے۔

۴۔ یہ نقطہ نظر اصلاً صوفیا کا تھا جن کے ہاں مخاطب کی رعایت، انسان دوستی وخدمت خلق کے فلسفہ کے باعث کفر واسلام کے مابین امتیاز بھی ختم سا ہو گیا تھا۔ بعض اوقات انھوں نے مقامی تصورات ورسوم کو بھی وسیلہ تبلیغ کے طور پر اختیار کر لیا۔ بلاشبہ محقق صوفیا ہمیشہ ان غالی خیالات کی تردید کرتے رہے، لیکن ان کے اکثر طبقات وسلاسل پر یہی رجحانات غالب رہے جس میں وحدت الوجود کے فلسفہ نے توحید وشرک کے مابین سارے فاصلے ہی ختم کر دیے۔ دور جدید میں تصوف کے زیر اثر حلقوں میں ایک اور فلسفہ نمودار ہوا جس کی ترجمانی برصغیر میں تبلیغی جماعت کا پیٹرن کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان عوام پر اصلاح وتبلیغ کے اس فکر کے گہرے اثرات پڑے ہیں، تاہم اس کا یہ پہلو بہت کھٹکتا ہے کہ اس میں نہی عن المنکر کے پہلو کو مکمل طور پر فراموش کر کے امر بالمعروف اور بشارت کے پہلو پر زیر صرف کیا جاتا ہے اور احادیث فضائل سے خاص طور پر مدد لی جاتی ہے۔

۵۔ ملاحظہ ہو عصر حاضر میں دین کی تشریح وتفہیم پر ایک نظر۔

۶۔ یہ خیال مولانا مودودی نے اپنی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کے مقدمہ میں (ص۴ تا ۶) میں ظاہر کیا ہے۔

۷۔ مصر میں ناصری مظالم کی شدت کے وقت جیلوں میں بند چند اخوانی نوجوانوں میں ردعمل کی کیفیت پیدا ہوئی اور انہوں نے صدر ناصر اور اس کے حواری مواریوں کی تکفیر شروع کر دی تو اس شدت کے خلاف اخوان کے مرشد عام استاذ حسن الہضیبی نے ایک کتاب لکھی 'دعاۃ لا قضاۃ' کہ ہم داعی ہیں، خدائی فوجدار نہیں۔ یہ کتاب گویا مولانا علی میاںؒ کے خیالات کی تائید ہی تھی۔